قائدین کی تربیت اور اوصاف وخصائص

از

مولانا محمد تقی صاحب امینی مدرسہ معینیہ درگاہ شریف اجمیر

(۲)

فنائیت کے چند اثرات جو قائدین کی داخلی وخارجی زندگی میں نمودار ہوتے ہیں

ذیل میں فنائیت کے چند اثرات ذکر کئے جاتے ہیں جو قائدین کی داخلی وخارجی زندگی میں نمودار ہوتے ہیں۔

(۱) ارادہ میں پختگی اور عزم میں مضبوطی۔

یہ وصف زندگی کا ایسا جوہر ہے کہ اس کے حاصل ہونے کے بعد کامیابی قدم چومنے پر مجبور ہوجاتی ہے، دنیا کے ہر انقلاب کی پشت پناہی اسی نے کی ہے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو اس نے روندا سمندر کی سطحوں کو اس نے پاٹا، ہواؤں کے رخ کو اس نے بدلا، سورج کی شعاعوں کو اس نے گرفتار کیا۔ ستاروں کی گذرگاہوں تک یہ پہونچا غرض دنیا کی کوئی کامیابی آپکو ایسی نہ ملے گی جو اس کے ذریعہ حاصل نہ ہوئی ہو۔

اسی بنا پر علماء اخلاق کی رائے ہے کہ انسان کا مستقبل وراثت اور ماحول سے کہیں زیادہ اس کے ارادہ پر موقوف ہے[1]

[1] خواہش اور ارادہ میں فرق ہے ارادہ ایک فعلی اور کارکن کیفیت وحالت کا نام ہے اور خواہش ایک انفعالی اور کار پذیر حیثیت ہے (افادیت ص ۵ از جان اسٹوارٹ مل) ارادہ کے مختلف درجے ہیں کسی کا ارادہ فطرتاً قوی ہوتا ہے کسی کا کمزور اور کسی کا متوسط درجہ کا۔ جسم کی تربیت کی طرح ارادہ کی بھی تربیت ہوسکتی ہے یعنی وہ جس طرح ورزش وغیرہ سے ایک حد تک قوی اور سڈول ہوجاتا ہے اسی طرح کمزور ارادہ ایک حد تک قوی بن سکتا ہے اور قوی ارادہ قوی تر ہوسکتا ہے لیکن اس تربیت کے لئے بہترین زمانہ بچپن کا زمانہ ہے کیونکہ بچے ہر تربیت کو بآسانی قبول کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں کچھ لوگ تیسرے چوتھے برس سے ہی حتی المقدور اس کی تعلیم وتربیت شروع کر دیتے ہیں۔

(۲) مقصد کے ساتھ والہانہ شغف (۳) محبتہ ایثار و قربانی (۴) ذاتی و شخصی حیثیت کو ختم کر کے ساری جد و جہد اور قوت کا مصرف نفع عام (۵) خلوص و بے غرضی (۶) اقتدار، عزت شہرت مال و جائداد کی ہوس غرض کسی فائدہ کا سامنے نہ ہونا۔ [۱]

قرآن حکیم میں جتنے انبیاء کا تذکرہ ہے اُن میں سے تقریباً سب نے بے غرضی اور قوم سے کسی قسم کے ذاتی فائدہ کی توقع نہ رکھنے کا اعلان کیا ہے چنانچہ ہر نبی کے ذکر میں مندرجہ ذیل آیت ملتی ہے

وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العلمین

میں اپنی خدمتوں کا کوئی معاوضہ تم سے نہیں چاہتا میری مزدوری اللہ کے ذمہ ہے۔

یعنی میری حیثیت تاجر کی نہیں ہے بلکہ داعی و قائد کی ہے دونوں کی زندگیوں میں بنیادی فرق ہے، تاجر کی توقعات قوم سے وابستہ ہوتی ہیں اور محض دھوکا دینے کے لئے اللہ و مذہب اور خدمت وغیرہ کا نام لیتا ہے اور قائد کا سارا معاملہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے اور قوم کی خدمت ادائے فرض جان کر کرتا ہے۔

فنائیت کا ایک اور اثر کہ مصیبت و تکلیف میں عیش و راحت کی لذت محسوس ہوتی ہے

فنائیت کے ایک اور اثر کا ثبوت انبیاء کرام کی زندگی میں ملتا ہے نہایت غور و فکر کا مستحق ہے اور غالباً فلسفیوں کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی ہے وہ یہ کہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں قائدین کو جو تکلیفیں پیش آتی ہیں مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ اُن کے لئے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے جس قدر اس راہ کی مصیبتیں بڑھتی جاتی ہیں اسی قدر ان کے دل کی خوشحالیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جو راحت و سرور

---

[۱] ہو سکتا ہے فنائیت کا یہ اثر ان فلسفیوں کی سمجھ میں نہ آئے جنھوں نے انسان کو بالطبع خود غرض قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے نفع ذات کے لئے کرتا ہے حتیٰ کہ ماں باپ کی محبت بھی خود غرضی سے خالی نہیں ہوتی لیکن سوال یہ ہے کہ انسانی دنیا کے سارے احکام و مسائل کیا ان فلسفیوں کی تحقیقات پر ختم ہو گئے ہیں؟ کیا اس بات کی کوئی ضمانت ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا فطرت انسانی کی مطابقت میں سب کچھ یہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں؟ اگر ہم فلسفیوں کے اس بیان کو تسلیم کر لیں جب بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ کیونکہ قرآن حکیم نے قائدین کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس کے لحاظ سے ان کے سامنے دنیوی اور مادی غرض نہیں ہوتی حقیقی اور معنوی غرض (اللہ کی رضا و محبت) بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ اسی کو قرآن حکیم نے وجہ اللہ، سبیل اللہ۔ مرضات اللہ سے تعبیر کیا ہے

انھیں کانٹوں پر لوٹ کر اور آگ کے انگاروں سے کھیل کر حاصل ہوتا ہے وہ دوسروں کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر نہیں مل سکتا ہے۔

درج ذیل حدیث میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

والذی نفسی بیدہ لوددت	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں یہ پسند کرتا ہوں
انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل	کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں اور قتل کیا جاؤں
ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل[۱]	پھر زندہ ہوں اور قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں اور قتل کیا جاؤں

فلسفی اس حقیقت کے ثابت کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوگئے ہیں کہ انسان کی ساری جدوجہد اور سارے اعمال و افعال کی غرض مسرت ہے یعنی فطرت انسانی کی جبلت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کی خواہش نہیں کرتی جو جزو مسرت ہے اور نہ اس کے حاصل ہونے کا وسیلہ۔[۲]

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قائدین کو مسرت کن چیزوں سے حاصل ہوتی ہے؟ سامان مسرت کس قسم کے ہیں؟ یہ حدیث قائدین کے مقام اور ان کی حیثیت متعین کرنے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

(۴) چوتھی عملیت ہے

عملیت یہ ہے کہ نظریۂ حیات کو بر روئے کار لانے کے لئے سرتاپا عمل بن جائے۔	عملیت کا مطلب یہ ہے کہ قائدین نظریۂ حیات کو بر روئے کار لانے کے لئے سرتاپا عمل بن جائیں راہ کی مشکلات اور رکاوٹیں اس لئے نہ ہوں کہ ان کے پائے استقلال کو لغزش آجائے اور اٹھا ہوا قدم رک جائے بلکہ اس لئے

ہوں کہ وہ اُن کے ذریعہ کام کی رفتار کو اور تیز کر سکیں، تحریک کو اور زیادہ بلندی کی طرف لے جاسکیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآنی قائدین اور مفکرین کی راہوں میں فرق ہے قائدین میں تخیل کے ساتھ ساتھ عملیت ہونا ضروری ہے اور مفکرین کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ قائدین کا کام خیالات و افکار کا پیدا کرنا اور اُن کو بر روئے کار لانے کے لئے سرتاپا عمل بن جانا ہے اور مفکرین کا کام صرف خیالات و افکار کا پیدا کر دینا ہے۔

---

[۱] بخاری وغیرہ [۲] ملاحظہ ہو مقالہ افادیت صفحہ ۱۶ و ۴۹ از جان اسٹوارٹ مل۔

قائدین کا فرض یہ ہے کہ جس نظریۂ حیات کو اپنایا ہے اُس کو پھیلانے اور ساری دنیا کو یقین کرانے میں پُوری قوت صرف کر دیں اور مال و دولت، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس میں سنگِ راہ ہے اس کو ہٹا دیں اور مفکرین کا فرض یہ ہے کہ وہ خود سمجھ لیں اور زیادہ سے زیادہ دوسروں تک پہنچا دیں۔ قائدین تخیل کو عملی طور پر حقیقت اور واقعیت کا پابند بناتے ہیں اور مفکرین حقیقت و واقعیت کو تخیل کی روشنی میں دیکھتے ہیں ظاہر ہے کہ ایک کا مقام دوسرے سے کتنا بلند ہے؟ اور ایک کا کام دوسرے سے کس قدر بڑھا ہوا ہے؟

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ غور و فکر کی طاقت اور عملیت دونوں ایک ساتھ بہت کم جمع ہوتے ہیں اسی بنا پر اجتماعیین کو یہ کہنا پڑا کہ "لیڈر عموماً ایسے افراد نکلتے ہیں جن کے اعصاب مریض اور جن کے قوائے عقلی مختل اور قریب بجنون ہوتے ہیں اعصاب کی بے حسی اُن کے جذبات کو مردہ کر دیتی ہے اور قوائے عقلی کا اختلال ان کو غور و فکر کی اجازت نہیں دیتا ہے[1]۔ اور اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ غور و فکر کی طاقت والے عملی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور جو عملی لحاظ سے مضبوط ہوتے ہیں ان میں غور و فکر کی طاقت کم ہوتی ہے۔

قائدین میں غور و فکر کی طاقت اور عملیت دونوں کا پایا جانا ضروری ہے

لیکن انبیاء کرام کی زندگی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان بزرگوں نے دونوں کا یکساں ثبوت پیش کیا۔ ایک طرف دماغی لحاظ سے وہ اتنے زیادہ بلند تھے کہ حالات اور وقت کی نزاکتوں کو سامنے رکھ کر دنیا کے مسائل کو جس طرح حل کیا تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور دوسری طرف عمل کے ہر میدان میں وہ پیش پیش دکھائی دیتے ہیں اب بھی بہت کمی کے ساتھ جامعیت کی مثالیں ملتی ہیں لیکن حالات کی ناسازگاری کی بنا پر میدان میں آنے والے اس سے بھی کم ہیں۔ بعض اجتماعیین کا خیال ہے کہ ذہن و ذکاوت فہم و فراست میں انبیاء کرام کا بڑھا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے صرف مضبوط عزم کی بنا پر دنیا ان کے قدموں پر گرنے کے لئے مجبور ہوئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے زندگی کے صرف ایک رُخ کا مطالعہ کیا ہے اس میں شک نہیں کہ مضبوط عزم پہاڑ جیسی طاقت کو ہٹا سکتا ہے۔ نمرود و فرعون جیسی سرکش گردن کو موڑ سکتا ہے لیکن کسی انقلاب کو بقاء اور دوام کی سعادت سے بہرہ یاب نہیں کر سکتا ہے اس کے لئے انقلاب کے رگ و ریشہ اور ہر بن و مو

[1] روح الاجتماع ص ۱۳۵

ہیں فہم و فراست کا پایا جانا ضروری ہے آج جو اُن کے مذہب کو بقاء دوام کی سعادت حاصل ہے اس کی بنیاد فہم و تدبر ہے جو اُن کی شخصیتوں پر حاوی تھا جس نے آن کے آن میں جدید دنیا کے بڑے سے بڑے نفسیاتی و اجتماعی مسائل حل کر کے رکھدئے تھے۔ ورنہ نہ معلوم مضبوط عزم کی بنا پر دنیا میں کتنے انقلاب آئے اور ختم ہو کر رہ گئے۔

عملیت کا ثبوت قرآن حکیم میں	عملیت کا ثبوت درج ذیل آیات میں ہے۔

الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ ۳۳/۳۹ جو لوگ اللہ کے پیغاموں کو پہونچاتے ہیں وہ صرف اللہ سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے

حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا تھا۔

اذھب الی فرعون انہ طغیٰ ۲۰/۲۴ فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہوگیا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے دھڑک پیغام ربانی پہونچانے کا حکم اس آیت میں ہے

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ اے پیغمبر آپکے رب کے پاس سے جو کچھ آپ پر اترا ہے اسکو آپ پہونچا دیجئے اگر آپنے ایسا نہ کیا تو اسکے پیغام پہنچانیکا فرض ادا نہیں کیا

تبلیغ میں جس قدر عملیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ انبیاء کرام کی زندگی سے ظاہر ہے زندگی کا کوئی موڑ اور کوئی موقف ایسا نہیں ہے جو ان بزرگوں کو پیش نہ آیا ہو اور کوئی قربانی ایسی نہیں ہے جس کا اُن سے مطالبہ نہ ہوا ہو اور کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں یہ موجود نہ رہے ہوں۔

بدقسمتی سے لوگوں کے پاس ان کی اتباع و پیروی کے نام پر صرف وہی باتیں باقی رہ گئی ہیں جن سے جذبات اور ہوا و ہوس کی تسکین ہوتی ہے اور شیطان نے "زین لھم الشیطن اعمالھم" کے بموجب اس پرستش کا لیبل لگا دیا ہے جس کی بنا پر ان کی زندگیاں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں اس کے علاوہ آج زندگی کچھ اس طرح تقسیم ہو کر رہ گئی ہے کہ انسان کسی کے بارے میں سوائے ایک حالت کے اور دوسری حالت کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا ہے اس لئے جب کبھی ان بزرگوں کی زندگیاں

ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہماری خود غرضی میں مبتلا نگاہیں ان کو اصلی شکل میں دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں۔

(۵) پانچویں اخلاقیت ہے۔ ؎۱

قائدین میں افکار عالیہ و اخلاق عالیہ کا پایا جانا ضروری ہے

اخلاقیت کا مطلب یہ ہے کہ قائدین ہر لحاظ سے بلند ہوں یعنی ان کے اندر افکارِ عالیہ پرورش پاتے ہوں اور زندگی کے ہر گوشہ میں انہیں افکار کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوں۔ عالی حوصلگی، فراخ دلی، اولوالعزمی، بلند ظرفی، مستقل مزاجی وغیرہ جیسی صفتیں اُن کی زندگی میں نمایاں ہوں، دیانت داری، امانت شعاری، حق پرستی، حق گوئی، وفا کیشی وغیرہ جیسی صفتیں اُن کی زندگی کا شیوہ بنی ہوئی ہوں۔ سخاوت ہو تو ایسی کہ سب حسب لیاقت مستفیض ہو سکیں، شفقت و رأفت ہو تو ایسی کہ شاہ و گدا امیر و غریب۔ قریب و بعید کسی کی تخصیص نہ کرے، تواضع ہو تو ایسی کہ ہر ایک کو اپنی گود میں جگہ دینے کے لئے تیار ہو۔ سموائی ہو تو اس قدر کہ ہر مکتب خیال کے لوگوں میں قدر مشترک کو تلاش کر کے اپنا کام کر جائے۔ جذبات پر اتنا قابو ہو کہ اس کی کشش اور اس کا ابھار مغلوب نہ کر سکے۔

غرض قائدین میں ہمہ قسم کے اخلاق کا پایا جانا ضروری ہے (۱) وہ بھی جن کا تعلق ادراک سے ہے (۲) وہ بھی جن کا تعلق جذبات سے ہے اور (۳) وہ بھی جن کا تعلق ارادہ سے ہے۔

اخلاق میں تسخیری صلاحیت ہوتی ہے

انبیاء کرام کی زندگی میں یہ ساری باتیں نہایت بلند پیمانہ پر پائی جاتی تھیں اُن کا اخلاق بذاتِ خود معجزہ اور نبوت کی سب سے بڑی دلیل تھا۔ اخلاق میں تسخیرِ قلوب کی کتنی صلاحیت ہے اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے انبیاء کی زندگی کا مطالعہ کرنے میں حالات کا ٹھیک جائزہ لیا ہے۔

قرآن حکیم کی درج ذیل آیت میں اسی تسخیری صلاحیت کی طرف اشارہ ہے،

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو　　　　اے پیغمبر یہ خدا کی بڑی ہی رحمت ہے کہ آپ لوگوں کے

؎۱ قائدین کے لئے ہر ایک کے مقام اور حیثیت کی تصدیق ضروری ہے۔ انبیاء کا سب سے بڑا وصف یہ رہا کہ انھوں نے ہر نبی کی تصدیق کی اور ابتدا میں قدر مشترک پر جمع ہو جانے کی دعوت دی۔ جیسا کہ "مصدقا لما معکم" اور "یا اهل الکتاب تعالوا الخ" وغیرہ آیتوں سے ظاہر ہے۔

کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا — لئے نرم دل واقع ہوئے اور اگر سخت دل ہوتے
من حولک ۲/۱۵۴ — تو لوگ آپکے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

قرآن حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے اس میں دراصل سیرت و کردار کی فضیلت اور اس کی اٹل کامرانیاں و فتحمندیاں بتانا مقصود ہے نیز یہ بات کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اُس کی سیرت کی فضیلت ہے اور لوگوں کے قلوب کو مسخر کرنے کی اس میں سب سے زیادہ صلاحیت ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ مکہ والوں نے رسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں کو تکلیفیں پہونچانے اور آپکے مشن کو ناکام بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا لیکن جب آپ مدینہ تشریف لے آئے اور مکہ کے لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو آپنے حسب ذیل طریقوں پر اُن کی مدد فرمائی

(۱) یمامہ سے جو رسد جاتی تھی آپ نے اس کو حسب سابق جاری کر دیا۔

(۲) غربار و فقرار کی امداد کے لئے پانچ سو اشرفیاں روانہ کیں۔

(۳) مختلف سامانِ ضرورت کھجور وغیرہ ابو سفیان کو بھیج کر اس کے معاوضہ میں جانوروں کی کھالیں طلب کیں تاکہ درآمد برآمد کا صحیح توازن قائم رہ سکے[۱]

قائدین کو ہر وقت جذبات قابو میں رکھنا چاہیئے — درج ذیل آیت سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ کتنے ہی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹیں اور کیسی ہی مخالفتوں کی آندھیاں چلیں قائدین کو نہ تو مایوس ہونا چاہیئے اور نہ ہی دل میں طلب بھلائی کے سوا کسی اور جذبہ کو جگہ دینا چاہیئے۔

لیس لک من الامر شئی او — اے پیغمبر آپ کو دشمنوں کے معاملہ میں کوئی دخل نہیں آپ کا
یتوب علیھم او یعذبھم — کام راہ حق کی دعوت دینا ہے اللہ چاہے تو ان سے درگذر
فانھم ظلمون ۲/۱۲۳ — کرے اور چاہے تو عذاب دے۔ عذاب اس لئے کہ وہ ظالم ہیں

اس آیت کا اندازِ تخاطب قابل غور ہے یہ اس صورت حال کی بات ہے کہ دشمنوں نے جنگ اُحد میں رسول اللہ کے دانت توڑ دیئے اور چہرہ اور سر کو زخمی کر دیا تھا اور شہید کر دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی

---

[۱] اسلام کا زرعی نظام ص ۸۳

اتفاق سے رسول اللہ کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے "کیف یفلح قوم خضبوا وجہ نبیھم بالدم"[۱]
وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرہ کو لہولہان کیا" بات کوئی ایسی قابل اعتراض نہ تھی
بلکہ حقیقتِ حال کا اظہار تھا لیکن یہ اظہار چونکہ ایسے حادثہ کے بعد جو رسول اللہ کی ذات کو پیش آیا تھا
اور ذاتیات کی آمیزش کا شبہ تھا اس بنا پر ایک خاص انداز میں تادیب کر دی گئی اس سے قائدین کی
زندگی کا پتہ چلتا ہے کہ انہیں کس قدر اپنی ذات سے بیگانگی اختیار کرنی پڑتی ہے؟ اور مخلوق کے لئے
وہ کس قدر رؤف ہوتے ہیں؟

حاصل یہ کہ قائدین کی اخلاقی زندگی اتنی منظم اور بلند ہو کہ کسی کو کسی گوشہ میں اس لحاظ سے لب
کشائی کا موقع نہ مل سکے۔ قرآن حکیم نے خصوصیت سے بعض انبیاء کی زندگی کے اُن پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے
جن کے بارے میں بعض اُن کے مخالفین غلط فہمی میں مبتلا ہو کر مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ
اگر اخلاقی زندگی ہی غیر واضح اور پردۂ اخفا میں رہی تو اور کون سی بنیاد ہو گی جس پر نبوت و قیادت
کی تعمیر ہو گی۔ ع[۲]

(۶) چھٹی قوتِ استدلال و بیان ہے۔

قوتِ استدلال و بیان یہ ہے کہ قائدین میں ایسی صلاحیت ہو کہ حالات و نفسیات کو سمجھ کر مخاطب کو سمجھا سکیں

قوتِ استدلال و بیان کا مطلب یہ ہے کہ قائدین میں بیان کی ایسی صلاحیت ہو کہ اپنے خیالات کو موثر انداز میں اہل زمانہ کی اصطلاح و زبان میں مخاطب کی طرف منتقل کر سکیں۔

چونکہ ہر زمانہ میں خیالات کی ادائیگی۔ طرزِ گفتار اسلوب تحریر اور طریقِ استدلال وغیرہ میں فرق ہوتا ہے اسی طرح سب مخاطب یکساں نہیں ہوتے اس بنا پر قائدین کے لئے زمانہ کی

ع چونکہ لیڈروں کی زندگی ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے اس لئے ان کی زندگی پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا مناسب نہیں پھر واقعات و مشاہدات کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ تبصرہ اس قدر سخت ہو جائے جو مضمون کی حیثیت کے لحاظ سے ناقابلِ برداشت ہو البتہ یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس دنیا میں قدرت کا عذاب دو شکلوں میں نمودار ہے (۱) پارٹی بازی اور (۲) لیڈری" او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض ۶/۶۵

[۱] جلالین ص۵۸۔

رعایت اور مخاطب کا لحاظ ضروری ہے بسا اوقات ان دونوں باتوں کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اس سلسلہ کی ساری جدوجہد اور ساری محنت بیکار جاتی ہے۔

انداز بیان اور طریق فہمائش خود اپنے اندر جادو جیسا اثر رکھتا ہے بشرطیکہ حالات ونفسیات کے مطالعہ کے ساتھ ہو "ان من البیان لسحرًا" (بعض بیان جادو جیسی تاثیر رکھتے ہیں)

حالات، موقع اور محل کے لحاظ سے کبھی حاکمانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی حکیمانہ، کبھی تاکید سے کام چل جاتا ہے اور اکثر تکرار کی ضرورت پڑتی ہے۵ کبھی صرف دعویٰ کافی ہوتا ہے اور کبھی دعویٰ کے ساتھ دلیل لازمی بن جاتی ہے اور کبھی اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ غیر شعوری طور پر ایک اثر دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے۔ بہر حال یہ ایک مستقل فن ہے اس میں کامیابی کے لئے نفسیات کے جاننے اور مزاج کے رُخ کو سمجھنے کی بہت ضرورت ہے ان کے علاوہ اس سلسلہ میں دو اور باتیں بڑی جاندار حیثیت رکھتی ہیں۔

(۱) قائدین میں اتنی جاذبیت اور کشش ہو کہ مخالفین مخالفتوں کے باوجود اس کے بارے میں سوچنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔

(۲) قائدین قوم وجماعت پر جس بات کا اثر ڈالنا چاہتے ہوں یا جو فعل ان سے کرانا چاہتے ہوں وہ خود اس کا زندہ نمونہ ہوں۔

یہ دونوں باتیں اپنی جگہ بڑی اہم ہیں اور بسا اوقات دعویٰ ودلیل وغیرہ سے کہیں زیادہ کام کرتی ہیں

نبیاء کرام کی زندگی اور ن حکیم سے اس کا ثبوت

انبیاء کرام کی زندگی میں مذکورہ تمام باتوں کی مثالیں موجود ہیں تحقیق وتفصیل کے لئے اس نظر سے ان کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ذیل میں ہم قرآن حکیم کی چند آیتیں اور چند واقعات ذکر کرتے ہیں۔

---

۵ تاکید سے مراد کسی بات کو زور دار طریقے پر تحکم کے ساتھ ادا کرنا اور تکرار سے مراد کسی خیال کا بار بار تکرار کرنا رسول اللہ کے میں اس کا ثبوت ملتا ہے "اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلثا" (بخاری ومشکوٰۃ) یہ تاکید وتکرار صرف سمجھانے کے لئے ہوتے ہیں بلکہ نفسیاتی لحاظ سے اثر اندازی میں خاص مقام رکھتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے قوت استدلال و بیان کے لئے اس طرح دعا کی تھی

واحلل عقدۃ من لسانی — اے اللہ میری زبان کی گرہ کھول دے اس طرح کہ

یفقھوا قولی ۲۰/۲ — میری بات لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے۔

گرہ کھلنے کی درخواست اور "یفقھوا قولی" کے ذریعہ اس کی شکل کی تعیین اور بیان کی یہ تعبیر کہ لوگ میری بات کو سمجھ لیں نہ کہ "میں انہیں سمجھا سکوں۔ یہ ساری باتیں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہاں بیان کی وہی صلاحیت مراد ہے جو قیادت کے فرائض انجام دینے کے لئے درکار ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو دعوت پہونچانے میں جو طریقہ اختیار کیا اس[1] سے ثابت ہوتا ہے کہ موقع کے لحاظ سے فہمائش کا جو طریقہ مناسب ہو وہ اختیار کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے سادگی ملحوظ رکھی جائے۔ نیز یہ بات کہ قائدین کے سامنے مقصد مخاطب کے دل میں مفہوم کا اتار دینا ہے جس طرح بھی ہو مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسانا یا کسی خاص دلیل پر اڑ کر بولتے بولتے اس کا ناطقہ بند کر دینا قیادت دعوت کی راہ کے خلاف ہے۔

فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام دعوت لیکر پہونچے تو فرعون نے انہیں نہایت نازک مقام پر کھڑا کر دیا اس نے کہا فما بال القرون الاولیٰ ۲۰/۱۶ جو پچھلے زمانہ میں گذر چکے ان کا کیا حال ہوتا ہے۔

یہ ایسا نازک مقام ہے کہ مذہب کی تاریخ میں فتنہ و فساد اور اختلاف کی بُنیاد ہمیشہ یہی مسئلہ رہا ہے اور شیطان نے ہمیشہ اپنی دسیسہ کاریوں کا جال اسی روپ میں پھیلایا ہے اور اسی کے ذریعہ دین و ایمان کی غارتگری کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اس سوال کے ادھیڑ بن میں لگ جاتے تو نہ صرف اس وقت بلکہ ہمیشہ کے لئے اپنی شخصیت ختم کر دیتے کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حق پرستوں نے "قرون الاولیٰ" کی صحیح پوزیشن جواب میں واضح کی ہے وہ عوامی رجحان کے خلاف رہی ہے اور پھر عوام نے ابتدا ہی میں انتہا کی ساری منزلیں طے کر لی ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو پ ۳ رکوع ۳